ڈاکٹر جمیل جالبی بحیثیت مدون

ڈاکٹر روبینہ رفیق*
ڈاکٹر عقیلہ شاہین**

Abstract:

Doctor Jameel Jalbi is a great writer, a literary, luminary, a historian, a researcher, an intellectual, translator and a critic of highest caliber of the day. The greatest achievement of his life is his work on "Tadveen-e-Mattan" which has become his identity. "Tadveen-e-Mattan" is a form of scientific research in which the published or un-published creative work of an author is searched, discovered, collected and categorized with incessant struggle and diligence to make it meaningful and communicative, for instance, "Dewan-e-Hassan Shoqi", "Dewan-e-Nusrit" and Masnavi "Kadam Rao Padam Rao" are the evidence of his dedication, valor, steadfastness and passion. The editing of Masnavi "Kadam Rao Padam Rao" that is the first known poetic masterpiece of Urdu Literature is a unique contribution to the language and literature. For that matter he has been awarded with the D.Lit degree (that is the highest degree in the world) by Sindh University. This article is about his services regarding his research and editing pursuits.

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور
** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو اقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

مرحلہ سب سے مشکل اور جاں گسل ہے۔ محقق نہ صرف اُن تمام سوالیہ نشانات پر غور وفکر کرتا ہے جو کسی باز یاب نسخے سے متعلق ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ کیا یہ مخطوطہ واقعتاً اُسی مصنف کا ہے جس کا نام تحریر ہے۔ اِس میں کوئی الحاقی یا جعلی متن تو شامل نہیں کر دیا گیا؟ کیا یہ اُسی زمانے کی تخلیق ہے جس کا محقق نے اندازہ لگایا ہے؟ یا اس سے کسی اور دور میں کسی اور ماہر نے اپنی صلاحیتوں سے یہ شکل دی ہے۔ یوں وہ روایت کو درایت کے عمل سے گزارتے ہوئے اشتباہ اور التباس کی بجائے سائنٹفک صداقت سامنے لاتا ہے۔ اس طرح وہ حقائق اور تخلیقی تجربات جو ماضی کا سرمایہ ہوتے ہیں وہ ادبی تاریخ کا اہم حصہ بن جاتے ہیں۔

تدوین عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی 'جمع کرنا'، 'تالیف کرنا' اور 'مرتب کرنا' کے ہیں۔ متن بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی 'وسط'، 'جمع' یا وہ تحریر و عبارت ہے جس کی تفہیم ممکن ہو۔ اس میں نظم، نثر، تخلیقی یا غیر تخلیقی کی کوئی قید نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ تحریری صورت میں موجود ہو چاہے یہ تحریر پتھر، چٹان، دیوار یا چمڑے پر ہی کیوں نہ لکھی گئی ہو۔ تدوین متن وہ عملی فن ہے جس میں مرتب و مدوّن اپنے تحقیقی و تنقیدی شعور کے ساتھ کسی قلمی نسخے یا تصنیف کو تحریر و املا کی صحت کے ساتھ ترتیب دیتا ہے۔ بعض اوقات متن کے اجزاء منتشر حالت میں ہوتے ہیں چنانچہ محقق کوشش کرتا ہے کہ مصنف کی منشا کے مطابق اسے ترتیب دے۔ جیسا کہ ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی کا کہنا ہے:

> ''تدوین متن یعنی متن کی تصحیح و ترتیب دراصل ایک عملی فن ہے جس میں مدوّنِ کتاب اپنی پوری توجہ اور محنت سے کسی مصنف کی کتاب کو پوری صحت کے ساتھ ترتیب دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اصل متن کو تلاش کرتا ہے خواہ وہ ایک جگہ ہو یا اس کے اجزاء منتشر حالتوں میں مختلف جگہوں پر ہوں، اُسے فراہم کرتا ہے پھر اس متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔(۱)

نورالاسلام صدیقی کے اس خیال کی عملی مثال محمد حسین آزاد کی 'نیرنگِ خیال' کہی جا سکتی ہے جس کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر کے آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۳ء میں دونوں حصوں کو مدوّن کر کے ایک کتاب بنا دی۔ گویا تدوین کسی تخلیق کے منتشر اجزاء کو صحیح ترتیب سے جمع کرنا یا کسی مصنف کی منتشر تخلیقات یا اِن تخلیقات کے مختلف نسخوں کا موازنہ کر کے درست متن مرتب کرنا ہے۔ کوئی بھی قابلِ تفہیم عبارت جو کسی عہد کے ادبی اور لسانی رجحانات کی نشان دہی کرے اِسی سلسلے کی کڑی ہوگی۔ متن کسی مصنف کے اصل الفاظ تحریر یا عبارت کا نام ہے۔ اگر اس تحریر کی تفسیر، تبصرہ یا حواشی لکھے جائیں تو یہ اضافی عبارت ہوگی۔ گویا اِس خیال کے تحت متن کی دو قسمیں بنتی ہیں۔ اصل متن اور اضافی متن۔ کچھ متون ایسے ہوتے ہیں جنہیں مصنف بولتا اور کاتب لکھتا ہے۔ یہ املائی یا تقلیدی متن کہلائے گا۔ متن کی ایک اہم صورت سماعی متن بھی ہے۔ وہ کہانیاں اور وہ سچائیاں جو اسلاف سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں جنہیں لوک

ورثہ یا لوک ادب کہا جاتا ہے، سماعی متن کے زمرے میں آتا ہے۔ تدوین تحقیق وتنقید کے مجموعے اور امتزاج کا نام ہے۔ تحقیق کے مرحلے میں متن کی تلاش اُس کے الحاق و اضافات، تصریفات اور گم شدہ کڑیوں کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اگر متن پر تاریخ اور سنہ درج ہے تو محقق کا کام آسان ہو جاتا ہے کہ وہ درج شدہ تاریخ وسنہ کی مدد دے اُس عہد کی دوسری تخلیقات سے موازنہ کرتا ہے۔ اگر تاریخ درج نہ ہو تو وہ موضوع، زبان و املا، فن کتابت، کاغذ اور روشنائی جیسی جزئیات اور باریکیوں سے زمانے کا تعین کرتا ہے۔ محقق معروضی اور موضوعی مطالعے کے بعد منضبط متن کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ تدوین متن میں اصلی متن کی تلاش بنیادی مرحلہ ہے۔ مختلف کتابوں کے مختلف زمانوں میں شائع ہونے والے ایڈیشن یا ایک ہی مخطوطے کے متعدد نسخے اگر متن میں اختلاف رکھتے ہیں تو ان مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں بہتر نسخے کو اصل متن قرار دے کر تدوین کی جاتی ہے۔ بعض اوقات متن کی تبدیلی خود مصنف کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے۔ اس کی بہت اہم مثال ممتاز مفتی کا سوانحی ناول 'علی پور کا ایلی' ہے۔ جس نے ممتاز مفتی کا یہ بیان باطل قرار دیا ہے کہ وہ اپنا لکھا کاٹتے نہیں تھے۔ 'علی پور کا ایلی' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں، دوسرا ۱۹۶۹ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں چھپا۔ ان تینوں ایڈیشنز کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ ممتاز مفتی نے مختلف ابواب کے عنوانات تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ متون میں بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔ الفاظ کی ترمیم واضافے کے علاوہ کہیں کہیں پورے کے پورے جملے حذف کر دیئے ہیں۔ مدوّن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تبدیلیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے صحیح متن فراہم کرے۔ تحقیق و تنقید دونوں کی اہلیت اور مزاج ہی سے تدوین متن کا فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ اس فریضے کو نظر انداز کرنا گویا اپنی ادبی وتاریخ ورثے کا انحراف ہے۔ اسی نکتے کی اہمیت کا احساس پروفیسر محمد حسن یوں دلاتے ہیں:

> ''اُردو میں تحقیق کا سب سے پہلا اور بنیادی مسئلہ تحقیق متن اور تصحیح متن کا ہے۔ تصحیح متن سے مراد میری یہ ہے کہ متداولہ کلیات یا تصانیف میں جو الحاقی یا غیر مستند حصے شامل ہو گئے ہیں اُن کی نشان دہی کی جائے اور جو حصے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں انہیں شامل کیا جائے۔ تحقیق متن سے مراد یہ ہے کہ اصل مصنف نے جس طرح لکھا ہے اسی شکل میں متن کو پیش کر دیا جائے۔ اُردو ادب کی بڑی بدقسمتی ہے کہ تحقیق وتنقید کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کے اعلان کے باوجود بھی ابھی تک ہمارے اساتذہ کی تحریروں کا بھی صحیح متن فراہم نہیں ہوسکا ہے۔''(۲)

چنانچہ اسی بنیادی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بعد بھی تحقیق وتنقید کے اصل راستے کھل سکیں گے۔

اُردو میں تدوین متن کی روایت تقریباً ڈیڑھ صدی پرانی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کے نظریۂ روایت پسندی میں ایک نکتہ یہ بھی شامل ہے کہ کسی بھی معاشرے کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب

ہم اپنے اسلاف کے افکار و خیالات اور ادبی و تخلیقی ورثے سے آشنا نہ ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ماضی میں تخلیق کیا گیا ادب تصحیح متن کے ساتھ شائع کیا جائے۔ چنانچہ کسی مصنف کی کتاب کو مرتب کرنا، کسی تصنیف کے قدیم ایڈیشن کو حواشی کے ساتھ نئی شکل عطا کرنا، کسی اہم مخطوطے کو تلاش کر کے مرتب کرنا اور پھر شائع کرنا تدوین متن میں شامل ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں تدوین متن کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب، مولوی عبدالحق، مالک رام، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر رشید حسن خاں، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ سلیم احمد جیسے محقق شاعر اور نقاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی نئے لوگوں میں اُن گنتی کے چند لکھنے والوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریر میرے لیے معنی رکھتی ہے۔ میرے اپنے خیالات کے کئی گوشے مجھ پر واضح نہ ہوتے اگر جمیل کی تحریریں میرے سامنے نہ ہوتیں۔''(۳)

گویا ڈاکٹر جمیل جالبی علم و ادب کی دنیا کا وہ طلسماتی کردار ہیں جو خود دوسروں کو افکار و خیالات کے اسرار و رموز اُن پر منکشف کرتے ہیں۔ تاریخ، تحقیق، تنقید، ترجمہ، تدوین اور بطور لغت نویس وہ ایک معتبر حوالہ ہیں۔ تہذیب و کلچر پر اُن کے مباحث انہیں ثقافتی رہنما کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ 'تاریخِ ادبِ اُردو' جس کی تین جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں اُن میں اُردو زبان کے آغاز سے لے کر اٹھارہویں صدی کے ادب کو صرف ادبی اور تاریخی حیثیت سے ہی نہیں دیکھا بلکہ برصغیر کے بدلتے تہذیبی عوامل و اثرات اس تاریخ کے پس منظر میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے:

> ''یہ تاریخِ ادب میری اپنی روح کا سفر ہے جسے میں نے برصغیر کی تہذیبی روح کی تلاش میں کیا ہے۔ سفر جاری ہے اور میری منزل ابھی دور ہے۔''(۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے محض اُردو زبان و ادب کی تاریخ ہی نہیں لکھی بلکہ ایک ثقافتی رہنما کی حیثیت سے ہند اسلامی تہذیب کی بازیافت کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ اُن کی تاریخِ ادب ایک علمی، فکری، ادبی اور تہذیبی دستاویز ہے جو اُن کی مسلسل محنت اور جگر کاوی کی روشن مثال ہے۔ انہیں نہ کسی ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلہ کی پروا۔ علم و ادب سے عشق ہی نے یہ جوئے شیر اُن سے کھدوائی ہے۔ 'تاریخِ ادبِ اُردو' ان کی برسوں کی ریاضت و محنت کا نتیجہ ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی ادبی تاریخ میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں مگر نقد و نظر کے میدان میں انہوں نے ادب پارے کو محض ادبی تاریخ کی ایک کروٹ قرار نہیں دیا بلکہ اسے منفرد اکائی کے روپ

میں دیکھا ہے۔'' (۵)

اِس منفرد اکائی کی معنویت اور اِس کی اہمیت کا احساس ہی دراصل انہیں تدوین اور ترتیب متن کے فن کی طرف لایا۔ اُردو میں قدیم اور کلاسیکی تخلیقات کو مرتب و مدوّن کرنے کی روایت کچھ زیادہ معتبر نہیں رہی۔ دکنی ادب کے حوالے سے کچھ محققین نے اِس روایت میں جان ڈالنے کی کوشش کی جن میں شمس اللہ قادری، مولوی عبدالحق، نصیر الدین ہاشمی، عبدالمجید صدیقی، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین زور اور ڈاکٹر جمیل جالبی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ دکنیات کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'دیوانِ حسن شوقی'، 'دیوانِ نصرتی' اور مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے متون کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے پہلے مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۹ء میں حسن شوقی کی دو مثنویوں اور تین غزلوں کو قدیم اُردو میں پیش کیا۔ سخاوت مرزا اور حسینی شاہد نے حسن شوقی کی کچھ غزلیات تلاش کیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے سامنے حسن شوقی پر کام کرنے کا کوئی باقاعدہ منصوبہ نہیں تھا۔ ۱۹۶۶ء میں 'تاریخِ ادبِ اُردو' کی پہلی جلد مرتب کرتے ہوئے انجمن ترقی اُردو پاکستان کے قدیم مخطوطات میں انہیں حسن شوقی کا کلام ملا جسے انہوں نے بڑے غور و خوض سے مرتب کیا۔ اس مرتب دیوان میں حسن شوقی کی دو مثنویاں 'فتح نامہ نظام شاہ' اور مثنوی 'میزبانی نامہ' کے علاوہ تیس غزلیں اور ایک طویل نظم شامل ہے۔ یہ دیوان ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا۔ حسن شوقی عادل شاہی دور کا وہ نمائندہ غزل گو شاعر تھا جس کی شاعری کی موضوعاتی اور ہیئتی ساخت اور جمال پرستی سے ولؔی تک نے استفادہ کیا تھا لیکن وہ وقت کی دھند میں کہیں کھو گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف اس کا کھوج لگایا بلکہ معاصرین اور قدیم اُردو شاعری کے منظرنامے میں اُس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا۔ رومانیت، جمال پرستی اور حسن و عشق کا بیان حسن شوقی کی غزلوں کا بنیادی موضوع ہے۔ جیسا کہ لکھتے ہیں:

> ''حسن شوقی کی غزل میں وصال کی خوشبو اُڑتی محسوس ہوتی ہے۔ محبوب اور اُس کی ادائیں حسن و جمال کی دلربائیاں، آنکھوں کا تیکھا پن، خدوخال کا بانکپن، موتی سے دانت، کلیوں جیسے ہونٹ، کٹھن ہیرے کی طرح تل، سرو قد، مکھ نور کا دریا، دلِ عاشق کو پھونک دینے والا سراپا اس کی غزل کے مخصوص موضوعات ہیں۔'' (۶)

گویا ڈاکٹر جمیل جالبی ترتیب و تدوین متن کو صرف کلام کو مرتب کرنا ہی نہیں سمجھتے بلکہ تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بھی اُس کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے حسن شوقی کی مثنویات کو بھی مثنوی کے فن پر پرکھتے ہوئے موضوعات اور اسالیب کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ فارسی اور ہندی زبان کے اثرات کے علاوہ وہ مشکل الفاظ قدیم اور جدید اُردو کی فرہنگ بھی دیتے ہیں تاکہ کلام کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا مؤقف ہے کہ اگر واقعتاً ہمیں اپنی تاریخ، تہذیب، روایت، زبان و ادب سے محبت

ہے تو ہمیں حسن شوقی جیسے شاعروں کو نہ صرف تلاش کرنا ہوگا بلکہ اُن کے کلام کو مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی پیش کردہ روایات کو بھی دیکھنا ہوگا کہ بعد کا ادب انہی روایات کی توسیع ہے:

''روایت یوں ہی نہیں بنتی اور بدلتی ہے جب سینکڑوں شاعر برسوں تک اپنے خونِ جگر سے راوی کے درخت کی آبیاری کرتے ہیں تب کہیں تخلیق کا سدا بہار پھول کھلتا ہے جسے کوئی ولی کہتا ہے، کوئی حافظ، سعدی، میر، غالب اور اقبال کا نام دیتا ہے۔ کوئی دانتے اور چوسر کے نام سے یاد کرتا ہے اور ہم حسن شوقی جیسے شاعروں کو بھول جاتے ہیں۔'' (۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے آپ کو صرف ادبی ماخذات کی تلاش و جستجو تک محدود نہیں کرتے بلکہ حقیقتوں کی تلاش میں غیر ادبی ماخذات کو بھی پوری توجہ دیتے ہیں۔ انہوں نے حسن شوقی کی مثنویوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں اُس دور کے تاریخی اور شاہی واقعات کی تفہیم قرار دیا ہے جن پر فارسی اور ہندی دونوں اسالیب کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ حسن شوقی کے مشکل اور نامانوس الفاظ کی فرہنگ سے اُس کے کلام کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ عربی، فارسی، ہندی، پنجابی، ہریانی، کھڑی، برج بھاشا، مرہٹی اور سنسکرت کے الفاظ اور اُن کے مفاہیم، اُن کی علمیت اور قابلیت کو سامنے لاتے ہیں، ساتھ ہی وہ ایک ماہر لسانیات کے طور پر اُردو زبان کی نتیجہ خیز معنویت کو بھی پیش کرتے ہیں:

''حسن شوقی کی زبان اُس زمانے کے دکن کی عام بول چال کی زبان ہے۔ اِس میں اُن تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کھچڑی سی پکتی دکھائی دیتی ہے جو آئندہ زمانے میں ایک جان ہو کر اُردو کی معیاری شکل متعین کرتے ہیں۔'' (۸)

گویا وہ حسن شوقی کی لفظیات و اسالیب میں اُردو کی ترقی یافتہ صورت دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی 'دیوانِ نصرتی' کے مرتب و مدوّن ہونے کی حیثیت سے خاص پہچان رکھتے ہیں۔ اُن کی تحقیق کے مطابق نصرتی سلطنتِ بیجاپور گیارہویں صدی ہجری کا آخری بڑا شاعر تھا جس نے تین بادشاہوں محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ کا دورِ حکومت دیکھا تھا۔ 'دیوانِ نصرتی' اوّلاً مجلس ترقی ادب لاہور کے سہ ماہی رسالے 'صحیفہ' میں شائع ہوا۔ (۹) ۱۹۷۲ء میں اِس کی دوسری اشاعت قوسین لاہور کی جانب سے منظر عام پر آیا۔ دیوانِ نصرتی میں نصرتی کی مثنویات، قصائد، ہجو، غزلیات، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ نصرتی کی مثنویات 'گلشنِ عشق، علی نامہ اور تاریخِ اسکندری، شمس اللہ قادری ۱۹۲۹ء میں شائع کر چکے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو نصرتی کی غزلیات، رباعیات، ہجو اور قطعات 'تاریخِ ادبِ اُردو' کی پہلی جلد مرتب کرتے ہوئے انجمن ترقی اُردو میں مختلف بیاضوں میں ملے۔ کلامِ نصرتی کے حوالے سے اگرچہ یہ کام اِس سے قبل ۱۹۴۴ء میں مولوی عبدالحق بھی کر چکے تھے

لیکن کچھ رباعیات اور غزلیات اُن کے مرتب کردہ دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق، تنقید، تاریخ اور تہذیب کے وسیع تناظر میں تصنیف و صاحبِ تصنیف کا یوں جائزہ لیتے ہیں کہ ہم عصر ادب میں کسی فن پارے کے فنی اوصاف، اُس کا تاریخی پس منظر اور زبان و بیان پر اُس عہد کے تہذیبی و ثقافتی اثرات اُسے وسیع معنویت عطا کرتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف اُن بیاضوں کی تفصیل بیان کی ہے جن سے انہوں نے کلامِ نصرتی کو مدوّن کیا ہے بلکہ صحیح اور صحت مند متون کے ساتھ اُن نامانوس الفاظ کی فرہنگ بھی دی ہے جو نصرتی کے کلام کی مشکلات کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق نصرتی وہ باشعور فن کار ہے جس نے اپنی سوچ و فکر کو اِس پختگی کے ساتھ مختلف اصناف میں یوں ڈھالا ہے کہ فنی اوصاف اور زبان و اسلوب آئندہ زمانوں کے ترقی یافتہ روّیوں کی نشان دہی کرتے ہیں مگر مغلوں کی فتح کے بعد شمالی ہند کی زبان کے غلبہ نے نصرتی کو وہ مقام نہ دیا جس کا وہ حق دار تھا۔بقول جمیل جالبی:

> ''یہ تہذیبی و لسانی تبدیلیوں کی ستم ظریفی ہے جو تاریخ کے موڑ پر اکثر اس طرح اچانک آتی ہیں کہ بڑے درخت گر جاتے ہیں اور چھوٹے درخت بڑے نظر آنے لگتے ہیں۔تاریخ کی اس ستم ظریفی نے نصرتی کو چھوٹا اور ولی کو بڑا بنا دیا......انہیں تہذیبی و لسانی تبدیلیوں نے نصرتی جیسے عظیم شاعر کو جو بحیثیت شاعر ولی سے کہیں بلند ہے۔ٹکسال باہر کر کے تاریخ کی جھولی میں پھینک دیا اور خود دکنیوں کو اِس کی زبان گراں گزرنے لگی......تہذیب کے سانچے بدلنے کے ساتھ جب اسلوب بدلتے ہیں تو عظمتیں کس طرح مل کر اپنی معنویت کھو دیتی ہیں۔ملا نصرتی تاریخ کی اِس سفاکی کی مثال ہے۔''(۱۰)

ترتیب متن کے سلسلے میں مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کی تدوین ڈاکٹر جمیل جالبی کا معتبر اور قابل قدر کارنامہ ہے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق فخر نظامی کی یہ مثنوی اُردو کی پہلی باقاعدہ تخلیق سمجھی جاتی ہے۔یہ مثنوی ۱۴۳۱ء سے ۱۴۳۵ء کے درمیانی عرصے میں بہمنی دورِ حکومت میں لکھی گئی۔اِس مثنوی کا مخطوطہ نامور محقق نصیر الدین ہاشمی کو حیدر آباد کی علم دوست شخصیت مولانا لطیف الدین ادریسی کے توسط سے ملا۔نصیر الدین ہاشمی نے رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں ''بہمنی عہدِ حکومت کا ایک دکنی شاعر'' کے عنوان سے فخر نظامی اور مثنوی 'کدم راؤ، پدم راؤ' پر تعارفی مضمون لکھا۔مولوی عبدالحق اس مثنوی پہ تحقیقی کام کرنا چاہتے تھے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے انہی کی خواہش کی تکمیل میں اس کٹھن کام کا بیڑا اُٹھایا۔اصل مخطوطہ خط نسخ میں ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خراب لکھا گیا تھا۔نامانوس زبان والفاظ میں مدوّن کی مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا۔چنانچہ محدب عدسہ سے چار پانچ سال کے مطالعے نے جالبی

صاحب کو اس قابل کیا کہ وہ اِسے مرتب کر سکیں۔ اِس دوران اِس مخطوطے کی تین نقلیں تیار ہوئیں۔ اس مثنوی میں عربی، فارسی کے علاوہ پنجابی، راجستھانی، گجری، سندھی، سرائیکی، کھڑی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جالبی صاحب کی محنتِ شاقہ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جائے کہ انہوں نے متعلقہ زبانیں بولنے اور جاننے والوں سے الفاظ اوران کے مفاہیم کی تصدیق کی۔ تب کہیں جا کر یہ مثنوی موجودہ شکل میں کہ دائیں جانب اصل نسخے کا عکس اور خطِ نستعلیق میں بائیں جانب تدوین کیا گیا متن شائع کر سکیں۔ ۱۰۳۳ اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں راجہ کدم راؤ اور اُس کے وزیر پدم راؤ سے متعلق روحیں تبدیل کرنے کا ایک ماورائی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ راجہ کدم راؤ کی روح جوگی کے فریب کی وجہ سے طوطے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پدم راؤ کی کوششوں سے راجہ دوبارہ انسانی روپ میں آتا ہے اور پھر روایتی داستانوں کی طرح جشن کا سماں اس کا اختتام ہے۔

اس مثنوی کے پختہ زبان واسلوب کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ یقیناً اس سے پہلے بھی دکنی ادب میں شعری تخلیقات موجود ہوں گی کہ اِس طور کی مثنوی کسی لسانی خلاء کی تخلیق نہیں ہوسکتی لیکن وہ سرمایہ ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ مثنوی کے ۲۹ عنوانات فارسی میں لکھے گئے ہیں لیکن اس میں اُس وقت بولی جانے والی تقریباً تمام زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرہنگ میں اُن کے معنی ومفاہیم پیش کیے ہیں تاکہ آج کا قاری اُس کا باآسانی مطالعہ کر سکے۔ تقریباً چھ سات سوسال قدیم زبان کے محاورات، کہاوتیں اور تلمیحات تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ تدوین متن کی ہی ایک جان دار روایت وتجربہ نہیں بلکہ یہ اُردو کا تقریباً چھ سات سوسال پرانا لسانی جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف مثنوی کی زبان کا موازنہ پنجابی، گجراتی، مرہٹی اور سندھی زبانوں سے کیا ہے بلکہ ان کے قواعد، ضمائر، افعال اور روزمرہ پر جن زبانوں کے اثرات نظر آتے ہیں اور اصل ماخذات سے ہٹ کر جو تبدیلیاں کی گئی ہیں اُن کی نشان دہی بھی کی ہے۔

یوں اُن کا کہنا بالکل بجا ہے:

> ''میں نے جتنی کوشش اور محنت اس مخطوطہ کو پڑھنے میں کی ہے اس کا اندازہ اہلِ علم اس مخطوطہ کے عکس پر ایک نظر ڈالنے سے لگا سکتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی خوشی حاصل ہوگئی۔'' (۱۱)

چنانچہ یہی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے پر جو تحقیق کی دنیا کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کو ۱۹۷۳ء میں سندھ یونی ورسٹی نے ڈی۔ لٹ کی اعلیٰ ترین سند بھی عطا کی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تدوینی خدمات میں ''کلیاتِ میراجی، میراجی ایک مطالعہ، ن۔م راشد ایک مطالعہ، ارسطو سے

ایلیٹ تک، قدیم اُردو لغت، قومی انگریزی اُردو لغت اور فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ'' کی دو جلدیں بھی شامل ہیں۔

اُردو شعر کی تاریخ میں ن۔م راشد اور میراجی روایت سے باغی وہ شعراء ہیں جنہوں نے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے نت نئے تخلیقی تجربات اُردو نظم میں کیے۔سیاسی، سماجی اور تہذیبی تناظر میں وہ انسان کی گم شدگی اور نئے آدمی کی تلاش کو اپنی سب سے بڑی خواہش بناتے ہیں۔ن۔م راشد کی تخلیقی جدت وندرت نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو بہت متاثر کیا۔چنانچہ ن۔م راشد ایک مطالعہ اسی تاثر کا نتیجہ ہے۔ن۔م راشد کے سوانحی کوائف، اُن کی شخصیت اور فن پر لکھے جانے والے سولہ مضامین کو مرتب کر دیا گیا ہے جو مختلف رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ان میں ساقی فاروقی کا ''حسن کوزہ گر''، فیض احمد فیض کا ''ن۔م راشد کی ابتدائی دور کی شاعری''، ڈاکٹر آفتاب احمد کا ''شاعروں کا شاعر''، عزیز احمد کا ن۔م راشد، ڈاکٹر وزیر آغا کا ن۔م راشد عالم خوندمیری کا ن۔م راشد انسان اور خدا، محمد حسن عسکری کا راشد کی ایک نظم۔ایک تجزیہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کا راشد کی چند نظموں کی ابتدائی صورتیں بہت اہم ہے۔ن۔م راشد ۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۵ء تک وقتاً فوقتاً آغا عبدالحمید، ضیاء جالندھری، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، امین حزیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام جو خطوط لکھتے رہے وہ خط اور راشد کی دس غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔یوں ن۔م راشد پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں کے لیے'ن۔م راشد ایک مطالعہ' ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

'کلیاتِ میراجی' ۱۹۸۸ء اور 'میراجی ایک مطالعہ' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئیں۔قدیم ہندو تہذیب لوک آہنگ مشرقیت، دخلیت جسمانی سطح سے روحانی بالیدگی کا سفر اور ہر نظم کے ہر مصرعے کو معنوی اکائی بنا دینے کا فن ڈاکٹر جمیل جالبی کو میراجی کی محبت میں مبتلا کر گیا۔کلیاتِ میراجی کی تدوین جالبی صاحب کے مخصوص مزاج تحقیق کی آئینہ دار ہے کہ زیر بحث شخصیت کی سوانح، عہد، تنقید اور پھر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو مدوّن کیا گیا ہے۔میراجی کی مطبوعہ نظموں کی تفصیل کہ وہ کس مجموعۂ کلام میں شامل ہیں اور اُن کی غیر مطبوعہ نظمیں انہیں معروف شاعر اختر الایمان اور ڈاکٹر وحید قریشی سے ملیں۔علاوہ ازیں انہوں نے بڑی محنت سے اُن نظموں کو بھی اکٹھا کیا ہے جو رسالہ ''ساقی، ادبی دنیا، ہمایوں، ادبِ لطیف، سیپ، نیا دور، خیال، اظہار اور ایشیا'' بمبئی میں شائع ہوئی تھیں۔میراجی نے رابندر ناتھ ٹیگور، پشکن، ملارمے، سیفو، ساؤ ساؤ، شیلے، ہکسلے، آسکر وائلڈ، شیکسپیئر جیسے اہم شعراء کی نظموں کے تراجم بھی کیے تھے جو'کلیاتِ میراجی' میں اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔کچھ نظموں کے مکمل حوالے نہ ہونے کے باوجود کہ یہ کب اور کن رسائل میں شائع ہوئے 'کلیاتِ میراجی' کلیات کی تدوین وترتیب میں ایک مستند مقام کی حامل ہے۔اس سلسلے

کی دوسری کڑی 'میرا جی ایک مطالعہ' ہے۔ اس میں میرا جی کے کوائف کے علاوہ اُن کی شخصیت پر شاہد احمد دہلوی، منٹو، حسن عسکری، محمود نظامی، اخلاق دہلوی، الطاف گوہر، احمد بشیر، سحاب قزلباش اور اختر الایمان کے مضامین شامل کیے گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً ''نئی تحریریں، کتاب، نقوش، فنون، سویرا، ماہِ نو، اوراق، صحیفہ، نیا دور اور شب خون'' میں شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں میرا جی کی گیت نگاری، تراجم اور خطوط کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

زبان و لسانیات لفظ شناسی و اصطلاح سازی سے ڈاکٹر جمیل جالبی کو انتہا کی دلچسپی ہے۔ اِس کا اندازہ اُن کے قدیم مخطوطات کی ترتیب و تدوین سے لگایا جا سکتا ہے۔ خود کہتے ہیں:

''لسانیات سے مجھے گہری دلچسپی ہے۔ اشتقاق کی تلاش میں ایک لطف آتا ہے۔ لفظوں کے معنی تلاش کرنے اور متعین کرنے میں مجھے ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔'' (۱۲)

قدیم اُردو لغت ۱۹۸۷ء میں مرتب کی گئی اور ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اِس لغت کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب ڈاکٹر جمیل جالبی 'تاریخِ ادبِ اُردو' کی پہلی جلد مرتب کر رہے تھے تو قدیم مخطوطات، بیاضوں اور تصانیف میں جو الفاظ انہیں مشکل اور نامانوس لگتے اُنہیں الگ سے لکھ لیتے۔ ۱۹۷۱ء تک تقریباً دس سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اُس وقت اُن کے پاس ۱۸ ہزار الفاظ جمع ہو چکے تھے جو انہوں نے تقریباً ۲۰۰ قلمی مخطوطات اور مطبوعات سے اکٹھے کیے۔ چنانچہ مختلف زبانوں کی لغات اور اہلِ علم کی مدد سے اُن کے معنی اور مفاہیم کا تعین کیا گیا۔ یوں قدیم اُردو لغت مرتب ہو گئی جو آج قدیم اُردو کی مطبوعہ کتب، مخطوطات اور قلمی بیاضوں کے مطالعے میں محققین کی رہنمائی کرتی ہے۔ اِس لغت سے قدیم اُردو کی املا، تلفظ اور اصول و قواعد بھی سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ یہ لغت وہ نشانِ راہ ہے جو آئندہ اِس موضوع پر کام کرنے والوں اور ان کی سمت کا تعین کرنے میں بنیادی ماخذ ثابت ہو گی۔ جیسا کہ مشفق خواجہ کا کہنا ہے:

''کسی زندہ زبان کے لفظ کے معنی متعین کرتے ہوئے لوگوں کی بول چال بہت سی مشکلوں کو دور کر دیتی ہے لیکن جو زبان صرف کتابوں میں نظر آئے اُس کے الفاظ کے معنی متعین کرنے کے لیے لغت نگار کا مطالعہ وسیع ہونا پہلی شرط ہے۔ جالبی صاحب نے یہ شرط بخوبی پوری کی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زیر نظر لغت اِس موضوع پر حرفِ آخر ہے لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آئندہ جو لوگ اِس موضوع پر کام کریں گے اُن کے لیے جالبی صاحب کی لغت بنیادی مواد کا کام دے گی۔'' (۱۳)

قومی انگریزی، اُردو لغت مطبوعہ ۱۹۹۲ء ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اُن کے نزدیک لغت نویسی ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ بالخصوص جب لغت ذو لسانی ہو۔ ایک زبان کے الفاظ، محاورات اور اصطلاحات کو دوسری زبان کی ساخت اور مزاج کے مطابق منتقل کرنا خاصا دقت طلب کام ہے۔ اِس لغت میں اُردو زبان کے بدلتے

ہوئے تصورات و مفاہیم کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق لغت بہت وسیع اور پھیلا ہوا علم ہے اور اِس سمندر میں جتنی غوطہ زنی کی جائے اتنے ہی قیمتی موتی ملتے ہیں۔ اِس لغت کے بارے میں اُن کا کہنا ہے:

> ''اِس لغت میں نہ صرف امریکہ، برطانیہ، اسکاٹ لینڈ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے مخصوص انگریزی الفاظ و محاورات بلکہ ۲۰۰ سے زیادہ علوم و فنون کی اصطلاحات بھی شامل ہیں۔ یہ سب وہ الفاظ و محاورات اور اصطلاحات ہیں جو معیاری انگریزی تحریروں میں استعمال ہوئے ہیں۔'' (۱۴)

گویا ایک لفظ کے معنی بیان کرتے ہوئے مختلف ممالک کی انگریزی میں مستعمل الفاظ کے تمام ممکنہ معنی و مفاہیم بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لسانی امتزاج کا یہ عمل اِس لغت کی اہمیت کو دو چند کر دیتا ہے۔

'فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ' کو دو جلدوں میں ۹۲۔۱۹۹۱ء میں جالبی صاحب نے مرتب کیا۔ اِس فرہنگ کی تدوین و ترتیب کا جواز اُن کے نزدیک یہ ہے:

> ''اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ ہمارا علمی اور تاریخی ورثہ ہے۔ اِس سرمائے میں برصغیر کے بہترین دماغوں کی انفرادی و اجتماعی کاوشیں شامل ہیں۔ سقوطِ حیدر آباد کے فوراً بعد جب اُردو ذریعۂ تعلیم کی روایت وہاں ٹوٹی تو یہ سارا علمی سرمایہ بھی منتشر ہو گیا۔ اب جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اِس سرمائے کی شیرازہ بندی دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ یہ سرمایہ یک جا مرتب کر کے شائع کیا جاتا تاکہ یہ نہ صرف محفوظ ہو جاتا بلکہ وضع اصطلاحات کی جدید روایت سے بھی اِس کا رشتہ قائم ہو جاتا۔ اِسی خیال کے پیشِ نظر میں نے کم و بیش اِس سارے سرمائے کو کھنگالا جو پاکستان میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ تھا اور اسے یک جا کر کے مرتب کر دیا۔'' (۱۵)

۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں حیدر آباد دکن میں شعبۂ تالیف و ترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ جامعہ عثمانیہ کے لیے تدریسی کتب لکھوائی اور ترجمہ کرائی جائیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے تحت جو کتابیں شائع ہوئیں اُن کے آخر میں اصطلاحات کی فہرست دی جاتی تھی۔ یہ علمی و ادبی اصطلاحات مختلف رسائل میں بھی شامل ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اِن اصطلاحات کو مرتب کرتے ہوئے بنیادی ماخذات یعنی جن جن تصانیف میں انہیں استعمال کیا گیا ہے اُن سے استفادہ کیا ہے۔ یوں ایک خاص عہد کا علمی اور تہذیبی ورثہ جس کے اثرات آج بھی اُردو میں موجود ہیں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اُردو ادب کی تاریخ، تنقید، تحقیق اور تدوین کا ایک معتبر حوالہ ہے جنہوں نے نہ صرف ادب و تہذیب کی گمشدہ کڑیوں کا سراغ لگایا ہے بلکہ سال ہا سال کی محنتِ شاقہ کے بعد ایسے ایسے جواہر ڈھونڈ

نکالے جو نہ صرف اُردو زبان و ادب کا اشاریہ ہیں بلکہ ایک خاص تہذیب، تاریخ اور فکر و فلسفے کے ترجمان بھی ہیں۔ بلاشبہ وہ بھی بابائے اُردو کہلانے کے مستحق ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ نورالاسلام صدیقی، ڈاکٹر، ''ریسرچ کیسے کریں''، شاد پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۱۰

۲۔ ایم۔سلطانہ بخش، مرتبہ ''اُردو میں اصولِ تحقیق''، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۵

۳۔ فلیپ ''تنقید و تجربہ''، مشتاق ڈپو کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۴

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادبِ اُردو''، جلد اوّل، ص ح

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''تنقید اور جدید اُردو تنقید''، انجمن ترقی اُردو کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۲

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ ''دیوانِ حسن شوقی''، انجمن ترقی اُردو کراچی، ص ۳۳

۷۔ ایضاً، ص ۴۸

۸۔ ایضاً، ص ۴۹

۹۔ ''صحیفہ''، مجلس ترقی ادب لاہور، اکتوبر ۱۹۷۲ء

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ ''دیوانِ نصرتی''، قوسین لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۴۔۱۵

۱۱۔ ایضاً، ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ''، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص ۳۰

۱۲۔ ایضاً، ''ادبی تحقیق''، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۶

۱۳۔ ''ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ'' مرتبہ گوہر نوشاہی، ۱۹۹۳ء، ص ۴۲۳

۱۴۔ ''فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ'' جلد اوّل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اوّل ۱۹۹۱ء، ص الف

۱۵۔ ایضاً